موذی

مشتاق احمد یوسفی

مرزا کرتے وہی ہیں جو اُن کا دل چاہے۔ لیکن اُس کی تاویل عجیب وغریب کرتے ہیں۔ صحیح بات کو غلط دلائل سے ثابت کرنے کا یہ ناقابلِ رشک ملکہ شاذ و نادر ہی مردوں کے حصّے میں آتا ہے۔ اب سگرٹ ہی کو لیجئے۔ ہمیں کسی کسی کے سگرٹ نہ پینے پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن مرزا سگرٹ چھوڑنے کا جو فلسفیانہ جواز ہر بار پیش کرتے ہیں وہ عام آدمی کے دماغ میں بغیر آپریشن کے نہیں گھس سکتا۔

مہینوں وہ یہ ذہین نشین کراتے رہے کہ سگرٹ پینے سے گھریلو مسائل پر سوچ بچار کرنے میں مدد ملتی ہے اور جب ہم نے اپنے حالات اور اُن کی حجّت سے قائل ہوکر سگرٹ شروع کردی اور اس کے عادی ہوگئے تو اُنھوں نے چھوڑدی۔ کہنے لگے، بات یہ ہے کہ گھریلو بجٹ کے جن مسائل پر میں سگرٹ پی پی کر غور کیا کرتا تھا، وہ دراصل پیدا ہی کثرتِ سگرٹ نوشی سے ہوئے تھے۔

ہمیں غور وفکر کی لَت لگانے کے بعد اُنھوں نے آنا جانا موقوف کردیا جو اِس بات کی علامت تھی کہ وہ واقعی تائب ہوگئے ہیں اور کسی سے مِلنا جُلنا پسند نہیں کرتے بالخصوص سگرٹ پینے والوں سے۔ (اُنہی کا قول ہے کہ بڑھیا سگرٹ پیتے ہی ہر شخص کو معاف کردینے کو جی چاہتا ہے - خواہ وہ رشتے دار ہی کیوں نہ ہو) میں گیا بھی تو کھنچے کھنچے رہے اور چند دن بعد ایک مُشترک دوست کے ذریعہ کہلوایا کہ ''اگر میں نے بربنائے مجبوری سگرٹ پینے کی قسم کھالی تھی تو آپ سے اِتنا بھی نہ ہوا کہ زبردستی پلادیتے۔ میں ہوں مجبور مگر آپ تو مجبور نہیں۔''

سات مہینے تک سگرٹ اور سوسائٹی سے اجتناب کیا۔ لیکن خدا بڑا مُسَبَّبُ الاَسباب ہے ۔ آخر ایک دن جب وہ وعظ سُن کر خوش خوش گھر لوٹ رہے تھے تو اُنھیں بس میں ایک سگرٹ لائٹر پڑا مل گیا۔ چنانچہ پہلے ہی بس اسٹاپ پر اُتر پڑے اور لپک کر گولڈ فلیک سگرٹ کا ڈبّہ خریدا (ہمیں اِس واقعہ پر قطعاً تعجُّب نہیں ہوا۔ اس لیے کہ گزشتہ کرِسمَس پر انھیں کہیں سے نائلون کے موزے چار آنے رعایت سے مل گئے تھے، جن کو ''میچ'' کرنے کے لیے اُنھیں ایک دوست سے قرض لے کر پورا سُوٹ سِلوانا پڑا) سگرٹ اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں میں دباکر لائٹر جلانا چاہا تو معلوم ہوا کہ اندر کے تمام پُرزے غائب ہیں۔ اب ماچس خریدنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا۔

ہم نے اکثر یہی دیکھا کہ مرزا پیمبری لینے کو گئے اور آگ لے کر لوٹے !

اور دوسرے دن اچانک غریب خانے پر گاڑھے گاڑھے دُھوئیں کے بادل چھا گئے،جن میں سے مرزا کا مسکراتا ہوا چہرہ رفتہ رفتہ طلوع ہوا۔ گلے شکوے تمام ہوئے تو نتھنوں سے دُھواں خارج کرتے ہوئے بشارت دی کہ سگرٹ میرے لیے موجب نشاط نہیں،ذریعہ نجات ہے۔

اِتنا کہہ کر اُنھوں نے چٹکی بجاکر اپنے نجات دہندہ کی راکھ جھاڑی اور قدرے تفصیل سے بتانے لگے کہ سگرٹ نہ پینے سے حافظے کا یہ حال ہوگیا کہ ایک رات پولیس نے بغیر بتّی کے سائیکل چلاتے ہوئے پکڑلیا تو اپنا صحیح نام اور ولدیت تک نہ بتا سکا، اور بفَضلہٖ اب یہ عالم ہے کہ ایک ہی دن میں آدھی ٹیلفون ڈائرکٹری حفظ ہوگئی۔ مجھے لاجواب ہوتا دیکھ کر اُنھوں نے فاتحانہ انداز سے دوسری سگرٹ سلگائی۔ ماچس احتیاط سے بجھاکر ہونٹوں میں دبالی اور سگرٹ ایس ٹرے میں پھینک دی۔

کبھی وہ اس خوشی میں سگرٹ پیتے ملیں گے آج رَمی میں جیت کر اُٹھے ہیں۔ اور کبھی (بلکہ اکثر و بیشتر) اس تقریب میں آج تو بالکل کھک ہوگئے۔ اُن کا دوسرا دعویٰ تسلیم کرلیا جائے کہ سگرٹ سے غم غلط ہوتا ہے تو اُن کے غموں کے مجموعی تعداد بہ شرح پچاس غم یومیہ، اَٹھارہ ہزار سالانہ کے لگ بھگ ہوگی اور بعض غم تو اتنے ضدّی ہوتے جارہے ہیں کہ جب تک تین چار سگرٹوں کی دھونی نہ دی جائے ٹوٹنے کا نام نہیں لیتے۔ اُنھیں عبرت دِلانے کے

اِرادے سے میں نے بادشاہ مطرید لطیس شَشَم کا قصہ سُنایا۔ جو یوں ہے کہ جب اس کو ہمہ وقت یہ اندیشہ لاحق رہنے لگا کہ موقع پاکر کوئی بدخواہ اسے زہر کھِلادے گا تو اس نے خود ہی روزانہ تھوڑا تھوڑا زہر کھانا شروع کردیا تاکہ خون اور قویٰ عادی ہوجائیں ۔اوروہ اس حفظِ ماتقدُّم میں اس حد تک کامیاب ہوا کہ جب حالات سے مجبور ہوکر اُس نے واقعی خودکشی کرنے کی کوشش کی تو زہر بالکل بے اثر ثابت ہوا اور اس نے بمشکل تمام اپنے ایک غلام کو خنجر گھونپنے پر رضامند کیا۔

بولے ''ناحق بچارے غلام کو گنہ گارکیا۔ اگر خودکشی ہی کرنا تھی تو زہر کھانا بند کردیتا۔چند ہی گھنٹوں میں تڑپ تڑپ کر مرجاتا۔''

لیکن جو احباب اُن کی طبیعت کے اُتار چڑھاؤ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کے یہ غم اَبدی اور آفاقی ہوتے ہیں جن کا سگرٹ تو درکنار حُقّے سے بھی علاج نہیں ہوسکتا۔ میں نے اکثر اُنھیں اِس غم میں سگرٹ کے کش پر کش لگاتے دیکھا ہے کہ سوئی گیس کا ذخیرہ سو سال میں ختم ہوگیا تو ان کی اپنی ملازمت کا کیا ہوگا؟ یا ایک لاکھ سال بعد انسان کے سر پر بال نہ ہوں گے تو حجّاموں اور سِکھّوں کا کیا حشر ہوگا؟ اور جب سورج پچاس ارب سال بعد بالکل ٹھنڈا پڑجائے گا تو ہم گھُپ اندھیرے میں صبح کا اخبار کیسے پڑھیں گے؟

ایک دفعہ تو سب کو یقین ہوگیا کہ مرزا نے واقعی سگرٹ چھوڑدی۔اس لیے کے مُفت کی بھی نہیں پیتے تھے اور ایک ایک سے کہتے پھرتے تھے کہ اب بھولے سے بھی سگرٹ کا خیال نہیں آتا۔بلکہ روزانہ خواب میں بھی سگرٹ بجھی ہوئی ہی نظر آتی ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ اب کی دفعہ کیوں چھوڑی؟

ہوا میں پھونک سے فرضی دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے بولے ''یونہی بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ جو روپیہ سگرٹ میں پھونک رہا ہوں،اس سے اپنی زندگی کا بیمہ کرایا جاسکتا ہے۔کسی بیوہ کی مدد ہوسکتی ہے۔''

''مرزا! بیمے میں چنداں مضائقہ نہیں۔لیکن جب تک نام پتہ معلوم نہ ہو، یہ بیوہ والی بات میری سمجھ نہیں آئے گی۔''

'' پھر یوں سمجھ لو کہ بیمے سے اپنی ہی بیوہ کی امداد ہوسکتی ہے۔ لیکن مذاق برطرف، سگرٹ چھوڑنے میں ہے بڑی بچت! جو صرف اس طرح ممکن ہے کہ جب بھی پینے کی خواہش ہو، یہ فرض کرلو کہ پی لی۔ اِس طرح ہر بار تمھارا ڈیڑھ آنہ بچ جائے گا۔''

میں نے دیکھا کہ اِس فارمولے سے مرزا نے بارہا ایک دن میں دس دس پندرہ پندرہ روپے بچائے۔ ایک روز دس روپے کی بچت دِکھاکر اُنھوں نے مجھ سے پانچ روپے اُدھار مانگے تو میں نے کہا ''غضب ہے! دن میں دس روپے بچانے کے باوجود مجھ سے پانچ روپے قرض مانگ رہے ہو؟''

کہنے لگے '' اگر یہ نہ بچاتا تو اِس وقت تمھیں پندرہ دینے پڑتے۔''

مجھے اس صورت حال میں سراسر اپنا ہی فائدہ نظر آیا۔ لہٰذا جب بھی پانچ روپے قرض دیئے، یہ سمجھ کر دیئے کہ اُلٹا مجھے دس روپے کا نقد منافع ہورہا ہے۔ مرزا کے متواتر تعاوُن کی بدولت میں نے اس طرح دو سال کی قلیل مدّت میں ان سے چھ سو روپے کمالیے۔

پھر ایک سہانی صبح کو دیکھا کہ مرزا دائیں بائیں دھوئیں کی کُلّیاں کرتے چلے آرہے ہیں۔ میں نے کہا ''ہائیں مرزا! یہ کیا بدپرہیزی ہے؟''

جواب دیا ''جن دنوں سگرٹ پیتا تھا کسی اللہ کے بندے نے اُلٹ کر نہ پوچھا کہ میاں کیوں پیتے ہو؟ لیکن جس دن سے چھوڑی، جسے دیکھو یہی پوچھتا ہے کہ خیر تو ہے کیوں چھوڑدی؟ بالآخر زِچ ہوکر میں نے پھر شروع کردی! بھلا یہ بھی کوئی منطق ہے کہ قتلِ عمد کے محرّکات سمجھنے کے لیے آپ مجرموں سے ذرا نہیں پوچھتے کہ تم لوگ قتل کیوں کرتے ہو؟ اور ہر راہ گیر کو روک روک کر پوچھتے ہیں کہ سچ بتاؤ تم قتل کیوں نہیں کرتے؟''

میں نے سمجھایا ''مرزا! اب پیمانے بدل گئے۔ مثال کے طور پر ڈاڑھی کو ہی لو۔''

اُلجھ پڑے ''ڈاڑھی کا قتل سے کیا تعلق؟''

''بندہ خدا! پوری بات تو سُنی ہوتی۔ میں کہہ رہا تھا کہ اگلے زمانے میں کوئی شخص ڈاڑھی نہیں رکھتا تھا تو لوگ

پوچھتے تھے کیوں نہیں رکھتے؟ لیکن اب کوئی ڈاڑھی رکھتا ہے تو سب پوچھتے ہیں کیوں رکھتے ہو؟''

اُن کا دعویٰ ہے کہ نکوٹین اُن کے خون میں اِس حد تک حل ہوگئی ہے کہ ہر صبح پلنگ کی چادر جھاڑتے ہیں تو سینکڑوں کھٹمل گرتے ہیں۔ یقیناً یہ نکوٹین ہی کے اثر سے کیفرِکردار کو پہنچتے ہوں گے۔ ورنہ اوّل تو یہ ناسمجھ جنس اتنی کثیر تعداد میں متّحِد ہوکر خودکشی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ دوم، آج تک سوائے انسان کے کسی ذی روح نے اپنے مستقبل سے مایوس ہوکر خودکشی نہیں کی۔ البتّہ یہ ممکن ہے کہ مرزا اپنے خون کو خراب ثابت کرنے میں کچھ مبالغہ کرتے ہوں۔ لیکن اتنا تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ سگرٹ کے دھوئیں کے اِس قدر عادی ہوچکے ہیں کہ صاف ہوا سے کھانسی اُٹھنے لگتی ہے۔ اور اگر دو تین دن تک سگرٹ نہ ملے تو گلے میں خراش ہوجاتی ہے۔

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا (اور ہم نے مرزا سے بہت پہلے ہوش سنبھالا) مرزا کے منہ میں سگرٹ ہی دیکھی۔ ایک مرتبہ ہم نے سوال کیا کہ تمھیں یہ شوق کس نے لگایا تو اُنھوں نے لطیفے داغنے شروع کردیے۔

''اللہ بخشے والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بچّوں کو سگرٹ نہیں پینا چاہیے۔ اس سے آگ لگنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس کے باوجود ہم پیتے رہے۔ عرصے تک گھر والوں کو یہی غلط فہمی رہی کہ ہم محض بزرگوں کو چِڑانے کے لیے سگرٹ پیتے ہیں۔''

'' مگر میں نے پوچھا تھا کہ یہ چسکا کس نے لگایا؟''

'' میں نے سگرٹ پینا اپنے بڑے بھائی سے سیکھا جب کہ ان کی عمر چار سال تھی۔''

'' اس رفتار سے انھیں اب تک قبر میں ہونا چاہیے۔''

''وہ وہیں ہیں۔''

اس کے باوجود مرزا کسی طرح یہ ماننے کو تیار نہیں کہ وہ عادتاً سگرٹ پیتے ہیں۔ یہ مسئلہ جب بھی زیرِ بحث آیا، انھوں نے یہی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ سگرٹ کسی گمبھیر فلسفے کے احترام میں یا محض خلقِ خدا کے فائدے کے لیے پی رہے ہیں۔

طوعاً و کرہاً! کوئی تین برس ادھر کی بات ہے کہ شُدہ شُدہ مجھ تک یہ خبر پہنچی کہ مرزا پھر تائب ہوگئے اور کامل چھتّیس گھنٹے سے ایک سگرٹ نہیں پی۔ بھاگم بھاگ مبارک باد دینے پہنچا تو نقشہ ہی اور پایا۔ دیکھا کہ تہنیت گزاروں کا ایک غول رات سے اُن کے ہاں فروکش ہے۔ خاطر مدارات ہو رہی ہے۔ مرزا انھیں سگرٹ پلا رہے ہیں اور وہ مرزا کو۔ مرزا ماچس کی ڈبیا پر ہر ایک فقرے کے بعد دو اُنگلیوں سے تال دیتے ہوئے کہہ رہے تھے :

'' بحمداللہ! (تال) میں جُوا نہیں کھیلتا (تال) شراب نہیں پیتا (تال) تماش بینی نہیں کرتا (تال) اب سگرٹ بھی نہ پیوں تو بڑا کُفرانِ نعمت ہوگا'' (تین تال)۔''

میں نے کہا ''لاحول ولاقوۃ! پھر یہ عِلّت لگالی؟''

مجمع کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا کر فرمایا ''یارو! تم گواہ رہنا کہ اب کی بار فقط اپنی اصلاح کی خاطر توبہ توڑی ہے۔ بات یہ ہے کہ آدمی کوئی چھوٹی موٹی عِلّت پال لے تو بہت سی بڑی عِلّتوں سے بچا رہتا ہے۔ یہ کمزوریاں (مائنر وائسز) انسان کو گناہِ کبیرہ سے باز رکھتی ہیں۔ اور یاد رکھو کہ دانا وہی ہے جو ذرا محنت کر کے اپنے ذات میں کوئی ایسا نمایاں عیب پیدا کرلے جو اُس کے اصل عیبوں کو ڈھانپ لے۔''

'' اپنے پلے کچھ نہیں پڑ رہا۔''

اپنے ستّار عیوب کا پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے ''یہ پیوگے تو خود بخود سمجھ میں آجائے گا۔ اس فلسفے میں قطعی کوئی اپچ پیچ نہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا۔ اگر کوئی شخص خوش قسمتی سے گنجا، لنگڑا یا کانا ہے تو اس کا یہ سطحی عیب لوگوں کو اِس قدر مُتوجّہ کرلیتا ہے کہ اصل عیبوں کی طرف کسی کی نظر نہیں جاتی۔ مثال میں جولیس سیزر، تیمور لنگ اور رنجیت سنگھ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ویسے کسی سو فیصدی پارسا آدمی سے مل کر کسی کا جی خوش نہیں ہوتا

تم جانتے ہو کہ میں آوارہ و اوباش نہیں، فاسق و فاجر نہیں، ہرجائی اور ہر چگ نہیں۔ لیکن آج بھی (یہاں مرزا نے بہت سا لذیذ دُھواں چھوڑا) ـــــ لیکن آج بھی کسی خوبصورت عورت کے متعلق یہ سنتا ہوں کہ کہ وہ پارسا بھی ہے تو نہ جانے کیوں دل بیٹھ سا جاتا ہے۔''

''مرزا! سگرٹ سبھی پیتے ہیں مگر تم اِس انداز سے پیتے ہو گویا بدچلنی کر رہے ہو۔''

''کسی اچھے بھلے کام کو عیب سمجھ کر کیا جائے تو اُس میں لذّت پیدا ہوجاتی ہے۔ یورپ اِس گُر کو ابھی نہیں سمجھ پایا۔ وہاں شراب نوشی عیب نہیں۔ اِسی لیے اس میں وہ لُطف نہیں آتا۔''

'' مگر شراب تو واقعی بُری چیز ہے! البتّہ سگرٹ پینا بُری بات نہیں۔''

''صاحب! چار سگرٹ پہلے یہی بات میں نے اِن لوگوں سے کہی تھی۔ بہر کیف میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ سگرٹ پینا گناہِ صغیرہ ہے۔ مگر غُصّہ مجھے اُن سادہ لوح حضرات پر آتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ سگرٹ نہ پینا ثواب کا کام ہے۔ مانا کہ جھوٹ بولنا اور چوری کرنا بُری بات ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ہاں لوگ یہ توقُّع رکھتے ہیں کہ حکومت اُن کو ہر بار سچ بولنے اور چوری نہ کرنے پر طلائی تمغہ دے گی۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ مرزا تمام دن لگاتار سگرٹ پیتے مگر ماچس صرف صبح جلاتے تھے۔ شمار یاد نہیں۔ لیکن ان کا اپنا بیان ہے آج کل ایک دن میں بیس فٹ سگرٹ پی جاتا ہوں اور وہ بھی اس شکل میں کہ سگرٹ عموماً اس وقت تک نہیں پھینکتے، جب تک انسانی کھال جلنے کی چِراند نہ آنے لگے۔ آخر ایک دن مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور میں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا مرزا! آخر کیا ٹھانی ہے؟''

میری آنکھوں میں دُھواں چھوڑتے ہوئے بولے ''کیا کروں۔ یہ موذی نہیں مانتا۔''

مرزا اپنے نفسِ اَمّارہ کو (جس کا محل وقوع ان کے نزدیک گردن کے جنوب مغربی علاقے میں ہے) اکثر اسی نام سے یاد کرتے، چمکارتے اور للکارتے ہیں۔

میں نے کہا ''فرائڈ کے نظریہ کے مطابق سگرٹ پینا ایک رجعتی اور بچکانہ حرکت ہے۔ جنسی لحاظ سے نا آسودہ

افراد سگرٹ کے سرے کو غیر شعوری طور پر نپّل کا نعمُ البدل سمجھتے ہیں۔''

''مگر فرائڈ تو انسانی دماغ کو ناف کا ہی کا ضمیمہ سمجھتا ہے۔''

''گولی مارو فرائڈ کو! بندۂ خدا! اپنے آپ پر رحم نہیں آتا تو کم ازکم اُس چھوٹی سی بیمہ کمپنی پر ترس کھاؤ جس کی پالیسی تم نے لی ہے۔ نئی نئی کمپنی ہے۔ تمھاری موت کی تاب نہیں لا سکتی۔ فوراً دیوالے میں چلی جائے گی۔''

''آدمی اگر قبل از وقت نہ مرسکے تو بیمے کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔''

''مرزا! بات کو مذاق میں نہ اُڑاؤ۔ اپنی صحت کو دیکھو۔ پڑھے لکھے آدمی ہو۔ اخبار اور رسالے سگرٹ کی بُرائی میں رنگے پڑے ہیں۔''

''میں خود سگرٹ اور سرطان کے بارے میں اتنا کچھ پڑھ چکا ہوں کہ اب مطالعہ سے نفرت ہوگئی!'' انھوں نے چٹکلہ دہرایا۔

اِس مد میں بچت کی جو مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مرزا سارے دن مانگ تانگ کر سگرٹ پیتے ہیں۔ (ماچس وہ اصولاً اپنی ہی استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ماچس مانگنا بڑی بے عزّتی کی بات ہے۔ آڑے وقت میں رسید لکھ کر کسی سے سو دو سو روپے لینے میں سُبکی نہیں ہوتی۔ لیکن رسید کا ٹکٹ بھی اسی سے مانگنا شانِ قرض داری کے خلاف ہے) دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ ایسے مارکہ کے سگرٹوں پر اُتر آتے ہیں جن کو وہ پیکٹ کی بجائے سگرٹ کیس میں رکھنا اور اُلٹی طرف سے جلانا ضروری خیال کرتے ہیں۔

لیکن نو دس ماہ پیشتر جب موذی اِس طرح بھی باز نہ آیا تو مرزا نے تیسرا اور آخری حربہ استعمال کیا۔ یعنی سگار پینا شروع کردیا جو اُن کے ہاتھ میں چھڑی اور منہ میں نفیری معلوم ہوتا تھا۔ پینے، بلکہ نہ پینے، کا انداز یہ تھا کہ ڈرتے ڈرتے دو تین اوپری کش لے کر احتیاط سے بُجھا دیتے اور ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد اوسان دُرست ہونے پر پھر جلا لیتے تھے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس طریقۂ استعمال سے طلب بھی مٹ جاتی ہے اور سگار کی عمر بڑھ جاتی ہے سو الگ۔ (یہاں اتنا اور عرض کردوں تو نامناسب نہ ہوگا کہ اُنھوں نے اپنی جوانی کو بھی اِسی طرح سینت سینت کر رکھنا چاہا، اس لیے

قبل از وقت بوڑھے ہوگئے)۔ چنانچہ ایک ہی سگار کو دن بھر ''آف ''اور''آن'' کرتے رہتے ۔ پھر چراغ جلے اُسی کو ٹیکتے ہوئے کافی ہاؤس پہنچ جاتے۔ خلقِ خُدا اُن کو غائبانہ کیا کہتی ہے، اِس پر اُنھوں نے کبھی غور نہیں کیا۔ لیکن ایک دن دُھواں منہ کا منہ میں رہ گیا، جب انھیں اچانک یہ پتہ چلا کہ ان کا جلتا بُجھتا سگار اب ایک طبقاتی علامت (سمبل) بن چکا ہے۔ ہوا یہ کہ کافی ہاؤس کے ایک نیم تاریک گوشے میں آغا عبدالعلیم جامؔ منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ مرزا کہیں پوچھ بیٹھے کہ آغا آج بُجھے بُجھے سے کیوں ہو؟ آغا نے اپنی خیریت اور دیگر احوال سے یوں آگاہی بخشی

شام ہی سے بُجھا سا رہتا ہے دل ہُوا ہے سگار مفلس کا

ایک ایسی ہی اُداس شام کی بات ہے ۔ مرزا کافی ہاؤس میں موذی سے بڑی بے جگری سے لڑ رہے تھے اور سگار کے یوں کش لگا رہے تھے گویا کسی راکھش کا دَم نکال رہے ہیں۔ میں نے دل بڑھانے کو کہا ''تم نے بہت اچھا کہ سگرٹ کا خرچ کم دیا۔ روپے کی قوتِ خرید دن بدن گھٹ رہی ہے۔ دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ خرچ کم کرو اور بچاؤ زیادہ۔''

سگار کو سپیرے کی پونگی کی مانند دھونکتے ہوئے بولے ''میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ آج کل ایک آنے میں ایک سالم سگرٹ مل جاتی ہے۔ دس سال بعد آدھی ملے گی!''

میں نے بات آگے بڑھائی۔ ''لیکن ہم یہی ایک آنہ آج پس انداز کرلیں تو دس سال بعد معہ سود دو آنے ہوجائیں گے۔''

'' اور اِس دُوَنّی سے ہم ایک سالم سگرٹ خرید سکیں گے جو آج صرف ایک آنے میں مل جاتی ہے۔''

جملہ مکمل کرتے ہی مرزا نے اپنا جلتا ہوا عصا زمین پر دے مارا۔ چند لمحوں بعد جب دھوئیں کے بادل چھٹے تو مرزا کے اشارے پر ایک بیرا پلیٹ میں سگرٹ لیے نمودار ہوا اور مرزا ایک آنے میں دو آنے کا مزہ لوٹنے لگے۔

پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ابھی تین ہفتے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ کسی نے مرزا کو پٹّی پڑھادی کہ سگرٹ ترک کرنا چاہتے ہو تو حُقّہ شروع کردو۔ ان کے لیے یہ ہومیوپیتھک مشورہ کچھ ایسا نیا بھی نہ تھا۔ کیوں کہ ہومیوپیتھی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ چھوٹا مرض دور کرنے کے لیے کوئی بڑا مرض کھڑا کردو۔ چنانچہ مریض نزلے کی شکایت کرے تو دوا سے نمونیہ کے اسباب پیدا کردو۔ پھر مریض نزلے کی شکایت نہیں کرے گا۔ ہومیوپیتھی کی کرے گا۔

بہرحال، مرزا نے حُقّہ شروع کردیا۔ اور وہ بھی اس اہتمام سے کہ گھنٹوں پہلے پیتل سے منڈھی ہوئی چلم اور نقشین فرشی، لیمو او رکپڑے سے اتنی رگڑی جاتی کہ جگرجگر کرنے لگتی۔ نیچہ عرقِ گلاب سے تر کیا جاتا۔ نے پر موتیا کے ہار لپیٹے جاتے۔ مُنہنال کیوڑے میں بسائی جاتی۔ ایک حُقّہ بھی قضا ہوجاتا تو ہفتوں اس کا افسوس کرتے رہتے۔ بندھا ہوا معمول تھا کہ پینے سے پہلے چار پانچ منٹ تک قوام کی تعریف کرتے اور پینے کے بعد گھنٹوں ''ڈیٹول'' سے کُلیاں کرتے۔ اکثر دیکھا کہ حُقّہ پیتے جاتے اور کھانستے جاتے اور کھانسی کے مختصر وقفے میں سگرٹ کی برائی کرتے جاتے۔ فرماتے تھے کہ ''کسی دانا نے سگرٹ کی کیا خوب تعریف کی ہے۔ ایک ایسا سُلگنے والا بدبودار مادّہ جس کے ایک سرے پر آگ اور دوسرے پر احمق ہوتا ہے۔ لیکن مشرقی پیچوان میں اس اَمر کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے کہ کم سے کم جگہ گھیر کر تمباکو کو زیادہ سے زیادہ فاصلے پر کردیا جائے۔

میں نے کہا ''یہ سب دُرُست! مگر اِس کا پینا اور اور پلانا دردِسر یہ بھی تو ہے۔ اس سے بہتر تو پائپ رہے گا۔ تُند بھی ہے اور سَستا کا سَستا۔''

چلم کے اَنگاروں کو دہکاتے ہوئے بولے ''بھائی! اُس کو بھی آزما چکا ہوں۔ تمھیں شاید معلوم نہیں کہ پائپ میں تمباکو سے زیادہ ماچس کا خرچ بیٹھتا ہے ورنہ یہ بات ہرگز نہ کہتے۔ دو ماہ قبل ایک انگلش پائپ خرید لایا تھا۔ پہلے ہی روز نہارمنہ ایک گھونٹ لیا تو پیٹ میں ایک غیبی گھونسا سا لگا۔ آنکھ میچ کے دوچار گھونٹ اور لیے تو باقاعدہ باکسنگ ہونے لگی۔ اب اس پائپ سے بچّیاں اپنی گڑیوں کی شادی میں شہنائی بجاتی ہیں۔